باب اول

مغل فوج کا آخری سالار

یہ دورِ زوال کے ایک فاتح کی کہانی ہے۔ ایک ناکام معاشرے کے کامیاب آدمی کی کہانی۔ یہ ایک آدم زاد اور نصف صدی پر پھیلی ہوئی اس کی بے تکان جدوجہد کی داستان ہے، لیکن یہ ایک خاندان اور قبیلے کی حکایت بھی ہے۔ یہ ایک خواب کی داستان ہے، جو سینکڑوں سال پہلے خراسان کی ایک وادی میں دیکھا گیا اور اب بھی پہاڑی کے چراغ کی طرح روشن ہے۔

اس کہانی کے پس منظر میں، دور، بہت دور تک غزنویوں، غوریوں، لودھیوں اور سوریوں کے گرد اڑاتے، شمشیر بکف لشکر دکھائی دیتے ہیں۔ ریگستانوں، وادیوں اور پہاڑوں میں اپنے سموں سے چنگاریاں اڑاتے گھوڑے جن کے شہ سوار دم نہیں لیتے اور جن کی آنکھوں میں چمک کبھی ماند نہیں پڑتی۔ یہ مغل لشکر کے آخری سالار کی کہانی ہے، جو اپنے قافلے سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ بیسویں صدی کے وسط میں طلوع ہوا۔ اپنی شمشیر آب دار سے، اس نے اپنے گرد و پیش کو چمک سے بھر دیا، لیکن وہ زمین کے سینے پر کبھی اکڑ کر نہ چلا۔

یہ ایک بچے کی کہانی ہے، جس نے یتیمی میں پرورش پائی، لیکن محرومی اور تنہائی اس میں بے چارگی اور کم ہمتی پیدا نہ کر سکی۔ یہ پانچ عشروں پر پھیلے ہوئے ایک مشکل، متنوع اور دشوار گزار سفر کی داستان ہے، جو عزم و ہمت سے طے کیا گیا۔ یہ ایک مسافر کی داستان ہے، جس نے کبھی اپنوں سے گلہ کیا اور نہ بیگانوں سے، زمانے کی شکایت کی اور نہ مخلوقِ خدا کی، جس نے کبھی ہاتھ نہیں پھیلا اور کبھی مدد نہیں مانگی۔ یہ کم آمیز اور سرفراز آدمی کی داستان ہے، جس نے کبھی اپنے غم کی حکایت بیان نہیں کی اور جسے آخر کار اس کی کامرانیوں نے آسودہ کر دیا۔

یہ ایک صاحبِ استقلال کی داستان ہے، جو عمر بھر اپنے مقاصد سے جڑا رہا۔ اس کی ہر منزل سفر کا ایک پڑاؤ بنتی گئی۔ وہ آدمی، جس نے جنگل کے سفر میں کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جس نے اپنا دھیان کبھی بٹنے نہ دیا اور جس نے اپنی راہ کبھی کھوٹی ہونے نہیں دی۔

وہ آدمی، جس نے دباؤ، دھونس، دھاندلی اور خوشامد کے معاشرے میں اپنی ترجیحات پر سمجھوتہ کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی۔ وہ آدمی جسے اس کی ماں نے آزاد جنا تھا، جس نے ایک آزاد آدمی کی زندگی گزاری اور شہید کی موت پائی۔

نعروں، تقریروں اور دعوؤں کے شور شرابے کی اس دنیا میں جو اب ریلوے کے پلیٹ فارموں اور بسوں کے اڈوں کی طرح ہوتی جا رہی ہے، وہ ایک ایسا آدمی تھا، جس کے پاس بہت تھوڑے سے لفظ تھے۔ ایک طویل، پر مشقت اور گونا گوں زندگی، اس نے ان تھوڑے سے لفظوں کے ساتھ گزار ڈالی۔

وہ زندگی بھر دعویٰ کرنے اور نعرہ لگانے سے گریزاں رہا۔ وہ آدمی، جس نے کبھی اپنے منہ پر ہاتھ پھیر کر کسی کو دھمکی دی اور نہ سینے پر ہاتھ مار کر کوئی اعلان کیا۔ منافقت کے شکار، ایک زوال پذیر معاشرے کا سچا اور کھرا آدمی، سچ کی طرح سادہ اور عناصرِ فطرت کی طرح کھوٹ سے پاک۔

یہ ایک بے ساختہ آدمی کی حکایت ہے، جس کے پاس اپنی ذات کے بارے میں چھپانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ کوہساروں، درختوں اور آبِ رواں کی طرح ایک جانا پہچانا اور واضح آدمی۔ اس کی زندگی میں دیانت اور سچائی اس طرح تھی جس طرح شاخِ شجر میں نمی اور روئیدگی۔ فلسفی کے بقول وہ عمر بھر کیوڑے کے درخت کی طرح خوشبو لٹاتا اور اپنے ماحول میں اجالا کرتا رہا اور اسے اس کی خبر تک نہ تھی۔ یہ ایک چپ چاپ آدمی کی داستان ہے جو ہزاروں، لاکھوں الفاظ میں بھی آسانی سے بیان نہیں کی جا سکتی۔ وہ آدمی، جس نے اپنی زندگی میں طے کردہ تقریباً ہر ہدف کو حاصل کیا اور اس پر بھی کسی زعم کا شکار نہ ہوا۔

یہ ایک باوفا خاندان کی صدیوں پر پھیلی ہوئی حکایت کا آخری باب ہے، جس نے نئی سرزمین پر ایک عہد کیا اور نسل در نسل اسے نبھاتے رہے۔ وہ خاندان جس نے مغلوں کا

ساتھ دینے کی قسم کھائی اور اسے پورا کیا۔ یہ نسل در نسل عزم و ہمت کی ایک لازوال داستان ہے، زمند قبیلے سے تعلق رکھنے والے اس خاندان کی تاریخ میں حیرتوں کے کئی باب ہیں اور ہر باب میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

جنرل اختر عبدالرحمٰن کے جدامجد عادل خان کے خاندان کی کہانی مسلم برصغیر ہی کی کہانی ہے۔ خیرہ کن عروج، المناک زوال، ذہنی شکست اور پھر سے ایک خواب کی بازیافت کی کہانی۔ ان بہادروں کے کارنامے تاریخ کا حصہ ہیں جو مرہٹوں اور راجپوتوں سے لڑتے رہے اور جنہیں پنجاب میں سکھ شورش کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ تاریخ کے نشیب و فراز میں وہ آخری ساعت تک چغتائیوں کے ساتھ رہے تا آنکہ آفتاب غروب ہوگیا۔

اس خاندان کا سب سے بڑا کارنامہ اس آدمی نے سرانجام دیا، جس سے اس کی توقع ہی نہیں رکھی گئی تھی۔ راکھ میں ایک چنگاری باقی رہ گئی تھی، اس سے الاؤ بھڑکا اور آسمان گیر ہوگیا۔

روسی فوج کے بہترین جرنیل، جن کی پشت پر دنیا کی سب سے بڑی جنگی مشین، جدید ترین اسلحہ کے انبار اور احتساب سے ماورا حکمرانوں کی مکمل توثیق موجود تھی، افغانستان میں غیر منظم لشکروں کی بغاوت کیوں نہ کچل سکے اور آخر کار خائب و خاسر ہوکر آمو کے پار کیوں چلے گئے؟ جب تاریخ اپنا کھوٹا کھرا الگ کرے گی تو آخر کار وہ اس سوال کا ایک سادہ اور دوٹوک جواب فراہم کرے گی۔ یہ سخت کوش، منتقم مزاج، انفرادیت پسند اور صاحب ایمان افغانیوں اور دو پاکستانی جرنیلوں کی وجہ سے ممکن ہوسکا۔ ان میں سے ایک میدان میں تھا۔ رزم گاہ کے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگتا، اعتماد سے سرشار اور خوف سے پاک اور دوسرا وہ جو اس کی پشت پر پہاڑ کی طرح کھڑا رہا کہ دست قدرت نے اسے ناقابل شکست ایمان کی دولت بخشی تھی۔ جنرل محمد ضیاء الحق اور جنرل اختر عبدالرحمٰن۔

یہ کارنامہ کس طرح انجام دیا گیا؟ ہمیشہ کی طرح اس کے پیچھے ایک خواب تھا۔ ہجرت کے سفر اور دشمن کی شقاوت قلبی کا تجربہ رکھنے والے دو سپاہیوں کا خواب جو اپنی قوم کی توہین پر آزردہ تھے۔ اسے تباہی کی دلدل سے نکالنا اور دشمن کا قرض چکانا چاہتے تھے کہ یکا یک ایک نیا چیلنج ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اگر وہ صاحب ایمان نہ ہوتے، اگر ان کے دلوں میں یقین کی مشعل روشن نہ ہوتی تو وہ اپنے ہم وطن سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں کی طرح ایک بے پناہ سپاہ سے مرعوب ہوکر سمجھوتہ کر لیتے، تب شاید تاریخ کا وہ باب مدتوں کے لیے مؤخر ہو جاتا جسے صرف افغانستان اور پاکستان ہی نہیں، کشمیر، برلن، بلغاریہ اور ماورالنہر میں اجالا کرنا تھا لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا، جب قدرت کسی کا انتخاب کر لیتی ہے تو وہ دوسروں جیسا نہیں رہتا، وہ عام لوگوں کی طرح دو اور دو چار کے پیمانے سے نہیں سوچتا۔

ایک اجلا اور برتر خواب آدمی کو بنا دیتا ہے؟ اگر غزنی کی سلطنت میں محمود نے ایک جنم نہ لیا ہوتا تو شاید لاہور کی ہندو شاہی کا اقتدار کابل سے آگے دریائے آمو اور شاید اس سے بھی آگے وسطی ایشیا تک پھیل جاتا، جہاں مزاحمت کرنے والی کوئی دوسری قوت موجود نہ تھی۔

اگر 1979ء میں پاکستان کی فوج کو جنرل اختر ایسا جرنیل نصیب نہ ہوتا تو شاید وہ ایک بار پھر 1971ء ایسے المیے سے دوچار ہو جاتی، لڑے بغیر اپنی جنگ ہار دیتی۔ غزنوی ترک تھا اور اس نے تاجکوں، ازبکوں اور نومسلم پشتون قبیلوں کی مدد سے آمو کی طرف بڑھتے ہندو لشکروں کو روک کر انہیں سومنات تک پسپا کر دیا۔ بار بار کے حملوں سے اس نے عالمی طاقت کا خواب دیکھنے والوں کی کمر توڑ ڈالی۔

اختر عبدالرحمٰن ایک پشتون تھا، غزنوی کی طرح اس کے لشکر میں بھی ازبک، تاجک، ترکمان، ہزارے اور پشتون جنگجو شامل تھے۔ جو زندگی کو آرزو اور آزادی سے بڑھ کر عزیز نہیں رکھتے۔ اس نے آمو پار کر کے دنیا کو تاراج کرنے والوں کا سامنا کیا اور ان کے لیے ایک ایسی ہزیمت کی بنیاد رکھی، جس سے وہ اب کبھی سنبھل نہ پائیں گے۔

وہ غزنوی کی طرح اپنے فیصلے کرنے کے لیے آزاد نہیں تھا کہ وہ ایک پیشہ ور فوج کا تنخواہ دار سالار تھا، ورنہ وہ افغانستان سے بہت پہلے ایک اور میدان جنگ کا انتخاب کرتا۔ 30 سال وہ کشمیر میں جنگ لڑنے کا خواب دیکھتا رہا لیکن اس کی تقدیر میں ایک اور میدان لکھا تھا۔ اس جنگ کے آخری مرحلے میں اس نے اپنے سردار جنرل محمد ضیاء الحق کی مدد سے افغانستان میں روشن کی جانے والی آگ کی ایک چنگاری کشمیر کی وادیوں میں پھینک دی تھی۔ اسی چنگاری سے اب کشمیر کے چنار روشن ہیں اور اسی کی بدولت وہ وادیِ جنت نظیر کے اہل جہاد کی دعاؤں میں زندہ ہیں۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی اپنا حقیقی کردار زندگی کے آخری مرحلے میں ادا کرتا ہے۔ اس وقت جب کوئی کارنامہ انجام دینے کی ایک موہوم سی آرزو ہی باقی ہو، ایک چیلنج اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور پھر یوں اس کے جوہر کھلتے ہیں جیسے پتھر کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹ بہے۔

لیڈروں کے لیڈر محمد علی جناحؒ اس وقت 64 سال کے تھے جب انہیں اپنی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا معرکہ درپیش ہوا۔ اختر عبدالرحمٰن 1979ء میں 55 سال کے تھے جب روس کی افواج قاہرہ افغانستان میں داخل ہوئیں۔ اگرچہ وہ پاکستانی فوج میں جنگوں کا سب سے زیادہ تجربہ رکھنے والے جرنیل تھے، لیکن یہ ان کے سان گمان میں بھی نہ تھا

کہ یکا یک انہیں ایک ایسی جنگ سے واسطہ پڑے گا، جس کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں گیا تھا۔

بدترین حالات میں اپنے اعصاب پر قابو اور اپنے خدا پر یقین رکھنے والے جنرل محمد ضیاء الحق رومان پسند ترہ کئی کے بعد سفاک حفیظ اللہ امین کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہیں اپنی قوم سے جنگ نہیں کرنی چاہیے۔ انہیں اندازہ تھا کہ یہ جنگ کیسی تباہی لائے گی؟ چنانچہ انہوں نے کابل میں ایک کے بعد بعد دوسرے کٹھ پتلی حکمران سے کہا کہ اگر وہ اصلاح پر آمادہ ہوں تو پاکستان کی مدد کرنے کے لیے تیار ہے۔ یکا یک روسی افواج پاکستان کی شمالی سرحدوں پر پہنچ گئیں۔ جنرل ضیاء الحق نے فوراً ہی اپنے نائب کو طلب کر کے جو روس نواز کمیونسٹوں سے برسر اقتدار مجاہدین کے لیے محدود سے امدادی پروگرام پر عمل کر رہا تھا، ایک ایسا منصوبہ بنانے کا حکم دیا، جس کے تحت کم از کم دو سال تک روسیوں کو الجھائے رکھا جائے۔

جنرل اختر عبدالرحمٰن نے یہ منصوبہ نہیں بنایا، جس کا کمانڈر انچیف نے انہیں حکم دیا تھا۔ اس کے برعکس جب وہ چند روز کے بعد اپنے سردار کے پاس واپس گئے تو ان کے پاس ایک اور منصوبہ تھا، روسیوں کو افغانستان سے نکال پھینکنے کا منصوبہ۔

جنرل اختر عبدالرحمٰن نے جو صرف سات ماہ پہلے تھری سٹار جنرل بنائے گئے تھے، اس شخص کے سامنے اپنے منصوبے کی وضاحت کی جو دوسروں کی بات ہمیشہ توجہ سے سنتا تھا اور جسے سپاہ گری سے عشق تھا۔ انہوں نے کہا روسی خطرے کے بارے میں ان کی رائے وہی ہے جو پاکستان کو درپیش بھارتی چیلنج کے بارے میں ہے اور جس سے کمانڈر انچیف بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے کہا کوئی فوج اول روز سے دفاعی پوزیشن اختیار کر کے کامیابی حاصل نہیں کر سکتی اور یہ کہ دشمن کو خوفزدہ کر کے ہی اپنا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بھارت کی بات دوسری تھی، لیکن کیا سوویت یونین ایسی سپر پاور کے ساتھ ویسا ہی جارحانہ رویہ اختیار کیا جا سکتا تھا؟ کیا روسیوں کو زچ کر کے افغانستان سے بھگایا جا سکتا ہے جو ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ دیہاتوں پر یلغار کرتے ہیں اور ان کے سروں پر ایم آئی 24 ہیلی کاپٹر اور مگ طیارے پرواز کر رہے ہوتے ہیں۔ جنرل اختر عبدالرحمٰن کا جواب اثبات میں تھا۔ ان کی رائے میں روسی افغانستان میں فوجی مداخلت کر کے ویسی ہی غلطی کر چکے تھے، جیسی کہ دوسری عالمگیر جنگ میں روس پر حملہ کر کے ہٹلر نے کی تھی۔

پھر سپاہی نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور اس بند کتاب کے اوراق اپنے سردار پر کھول دیئے جو گزشتہ سات ماہ میں افغانستان کی صورتحال پر غور کرتے ہوئے اس کے ذہن میں تشکیل پائی تھی، یہ ایک تحیّر خیز منصوبہ تھا لیکن ایک زنجیر کی طرح اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے پیوست تھی۔ منصوبہ ساز نے اس پر بہت سوچ بچار کیا تھا اور اس کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ مکمل اور بے داغ یقین کے ساتھ اس نے کہا کہ روسی ایک حماقت کر بیٹھے ہیں اور انہیں اس کی سزا دی جا سکتی ہے۔ جس طرح ماسکو کا رخ کرنے والے نپولین اور ویت نام میں افواج اتارنے والے امریکہ کو دی گئی تھی۔

اب صرف ایک سوال باقی تھا کیا افغان مجاہدین کے لیے مسلمان ممالک، مغربی یورپ اور سب سے بڑھ کر امریکہ سے مالی اور فوجی مدد حاصل کی جا سکے گی؟ آئی ایس آئی سے وابستگی کے سات مہینوں میں افغان حیرت پسندوں کی امداد کے حوالے سے سی آئی اے کے افسروں اور ممتاز امریکی شخصیتوں سے تبادلہ خیال کے حوالہ سے جنرل اختر عبدالرحمٰن کا جواب اثبات میں تھا۔ پاکستان کی دفاعی قوت کو مستحکم بنانے اور بھارت کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ ہمیشہ امریکہ سے قریبی دفاعی تعاون کے حامی رہے تھے اور اب اس پر پہلے سے زیادہ زور دینے لگے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ایران اور ویت نام کا زخم خوردہ امریکہ روس کی ہزیمت سے دوچار کرنا اور ایک یادرہ جانے والا سبق سکھانا چاہتا ہے۔

ویت نام کی جنگ کے بعد سے امریکہ مسلسل پسپائی کا شکار تھا اور سوویت یونین مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ ایرانی انقلاب کے بعد سے امریکی صدر کارٹر نامی اور نااہلی کی ایک علامت بن گئے تھے اور رائے عامہ مرتب کرنے والے ادارے دنیا کو بتا رہے تھے کہ امریکہ شہریوں کی اکثریت آئندہ سالوں میں سوویت یونین اور کمیونزم کی پیش قدمی پر یقین رکھتی ہے۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی وجہ سے، جسے ضیاء الحق ترک کرنے پر آمادہ نہ تھے، امریکہ کی اقتصادی امداد جس پر پاکستان دو عشروں سے انحصار کرتا آیا تھا، کم ہوتے ہوئے ملک کی اقتصادی امداد کا صرف تین فیصد رہ گئی تھی۔ قوم کی نفسیات پر 1971ء کی شکست کے سائے تھے، 1977ء کی عوامی تحریک کے بعد جس نے قوم کو دو گروہوں میں بانٹ دیا تھا، فوج اقتدار میں تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کے ایک مقدمے میں پھانسی دی جا چکی تھی۔ نومبر 1979ء میں دوسری بار عام انتخابات ملتوی ہونے کے بعد سیاستدانوں کی اکثریت ضیاء الحق پر برہم تھی۔ اخبارات پر سنسر نافذ تھا اور سرکاری ذرائع ابلاغ اپنا اعتبار کھو چکے تھے۔ بھارتیوں اور یہودیوں سمیت دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف ایک تکلیف دہ اور توہین آمیز شور شرابا برپا کیے ہوئے تھے۔ کیا روسی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ ایک موزوں صورتحال تھی؟

ضیاء الحق اب تک تصادم کو ٹالتے آئے تھے۔ 1974ء میں ترہ کئی پاکستان اور ایران سے مفاہمت پر آمادہ، داؤد خان کو فوج کی مدد سے قتل کر کے اقتدار میں آئے تو پاکستان

قومی اتحاد کے رہنماؤں، نواب زادہ نصراللہ خان، میاں طفیل محمد اور پیر پگاڑا نے لاہور میں ان سے ملاقات کر کے ترہ کئی حکومت کو تسلیم نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن ضیاء الحق نے کمیونسٹ حکومت کو تسلیم کر لیا اور پھر ترہ کئی کو قتل کر کے اقتدار سنبھالنے والے جنونی حفیظ اللہ امین کو بھی.....لیکن اب کابل کے تخت اقتدار پر کارمل براجمان تھا۔ ظاہر شاہ کے ایک جرنیل کا بیٹا جو اپنے ہم وطنوں کے اعتقادات کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور جو پہلی بار پنجشنبہ کے روسی ریڈیو سٹیشن سے اپنے اہل وطن سے مخاطب ہوا تھا۔

پونے دو سال ایک جرنیل اور حکمران کی حیثیت سے افغانستان کی صورتحال پر غور کرنے والے ضیاء الحق نے اختر عبدالرحمٰن سے اتفاق کیا اور انہیں افغانستان میں برسر پیکار حریت پسندوں کی مدد کے لیے ہر ممکن مدد فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے جنرل اختر عبدالرحمٰن سے کہا کہ پاکستان دو محاذوں پر پیش قدمی کرے گا۔ افغانستان کے عسکری محاذ پر، جس کے نگران وہ ہوں گے اور جسے مکمل طور پر خفیہ رکھا جائے گا جبکہ سفارتی محاذ کی ذمہ داری ضیاء الحق خود سنبھالیں گے۔

شطرنج کی بساط بچھ گئی تھی۔ رڈیارڈ کپلنگ کے ''عظیم کھیل'' کا دوسرا حصہ شروع ہونے والا تھا۔ امریکہ کے صدر جمی کارٹر نے جنہیں ان کی قوم امیدوں اور امنگوں کے ساتھ اقتدار میں لائی تھی اور جو آخری تجزیے میں ایک حکمران سے زیادہ ایک رومان پسند سیاسی دانشور ثابت ہوئے، صدر ضیاء الحق کو چند سو ملین ڈالر امداد کی پیشکش کی جن کا ملک روس کی فرنٹ لائن سٹیٹ بن چکا تھا اور جسے اب براہ راست کمیونزم سے خطرہ درپیش تھا۔ صدر نے اس امداد کو مونگ پھلی قرار دے کر مسترد کر دیا۔ وہ ایک جنگ لڑنے جا رہے تھے اور انہیں بیساکھیوں کی نہیں کمک کی ضرورت تھی۔ انہوں نے بنگلہ دیش کے صدر ضیاء الرحمٰن کی مدد سے اسلام آباد میں اسلامی کانفرنس کے وزرائے خارجہ کا اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا۔ ایک جرنیل کی طرح جو جنگ لڑنے کا فیصلہ کر چکا ہو، انہوں نے شکست خوردہ امریکی انتظامیہ کی طرف دیکھنے کی بجائے جن سے خود ان کے اہل وطن مایوس ہو رہے تھے، اپنے طور پر صف بندی کا فیصلہ کیا۔ اگر صدر ضیاء الحق کے اندازے درست تھے تو امریکیوں کے لیے جہاں قومی سلامتی کے نئے تصورات جنم لے رہے تھے اور کمیونسٹ روس کے مقابلے میں سخت گیر رویے کے حامی دانشوروں اور سیاستدانوں کی تائید وحمایت میں اضافہ ہو رہا تھا، آگے بڑھ کر پاکستان کی امداد کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ برسوں سے پاکستان کو اسلحی امداد مہیا کرنے سے انکار کر رہے تھے لیکن اب انہیں اس کے ایٹمی پروگرام کو حلق سے اتارنا تھا اور اس پر شرائط مسلط کرنے سے گریز کرنا تھا۔

ضیاء الحق سے نفرت کرنے والے بائیں بازو کے دانشور اور سیاسی کارکن اپنی چھپا نہیں سکتے تھے۔ جن کا فکری سرپرست پاکستان کی سرحدوں تک آ پہنچا تھا۔ ترقی پسند اخبار نویس ''افغان انقلاً'' کا خیر مقدم کر رہے تھے جو افغان دیہاتوں کے لیے آگ، بارود اور لوہے کا تحفہ لایا تھا۔ پشاور سے کراچی تک سارا ملک خوف اور اندیشوں کی حکمرانی میں تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان کی وسعتوں میں ایک قومی بغاوت پھوٹ پڑی۔ افغان عورتیں، بچے اور بوڑھے پاکستان کے مہاجر کیمپوں اور ان کے جواں سال میدان جنگ کا رخ کر رہے تھے۔ افغان فوج سے فرار کے واقعات ہونے لگے اور جس کسی میں ایمان اور حب وطن کی ایک چنگاری بھی باقی تھی، وہ ملحدوں کے خلاف جنگ میں اپنے ہم وطنوں سے جا ملا۔ قبائل نے بغاوت کر دی اور دیہات میں حکومت کا وجود ختم ہو گیا۔

افغانستان میں یہ بغاوت کتنے دن جاری رہے گی؟ اس بارے میں اندازے مختلف تھے۔ حریت پسندوں کے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا، فتح اور شکست کا نہیں۔ بیشتر مغربیوں کا اندازہ یہ تھا کہ مزاحمت چھ ماہ سے زیادہ عرصہ جاری نہیں رہے گی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی حیرت اور امید بڑھتی چلی گئی اور وہ امداد دینے پر آمادہ ہوتے گئے۔ قومی سلامتی کے امریکی سفیر زبگنیو برزنسکی کچھ دنوں میں اسلام آباد پہنچے۔ انہوں نے صدر ضیاء الحق کو بتایا کہ ان کا ملک پاکستان کی اقتصادی اور عسکری امداد کے لیے آمادہ ہے۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا افغانستان میں روسی ریچھ کو زخمی کیا جا سکتا ہے اور پھر امریکی حقیقت پسندی کے ساتھ سوال کیا کہ ان کی رائے میں افغان باغیوں کی مزاحمت کب تک جاری رہ سکتی ہے؟

ضیاء الحق نے گفتگو شروع کی اور جیسا کہ بعد میں برزنسکی نے امریکیوں کو واپس جا کر بتایا صدر کے اعتماد نے اسے ششدر کر کے رکھ دیا۔ ضیاء الحق نے امریکی دانشور کو بتایا کہ وہ روسیوں کو افغانستان میں مجروح کر کے الجھائے رکھنا نہیں بلکہ دریائے آمو کے پار دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا پاکستان کو صرف اپنے دفاع کے لیے نہیں بلکہ مجاہدین کے لیے بھی بڑے پیمانے پر اسلحہ چاہیے۔ برزنسکی نے ضیاء الحق کے حیران کر دینے والے بے پناہ عزم کا اعتراف ان کی موت کے فوراً بعد کیا۔ جب انہوں نے لندن ٹائمز کے لیے اپنے مضمون میں لکھا کہ ''وہ افغانستان میں روس کی عسکری اور سیاسی شکست کے واحد معمار تھے۔''

برزنسکی کو مغالطہ ہوا تھا، ضیاء الحق تنہا نہیں تھے۔ بے خوف شخصیت اور ذہن رسا رکھنے والے اختر عبدالرحمٰن ضیاء الحق کے ساتھ تھے، جنہیں وہ زیادہ نہیں جانتے تھے۔ ایک برزنسکی ہی کیا، اختر عبدالرحمٰن سے تو ایک دنیا ناآشنا تھی۔